وحیِ الٰہی

اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی

(۴)

جو لوگ مادیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور جن کی قوتِ فکر و نظر اس قدر محدود ہے کہ وہ جسم اور مادہ کی حد بندیوں سے گذر کر روح اور عالم مجردات کی باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اُن کو تعجب ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر ہونے کے باوجود بھلا ایسا کونسا مقام پیش آسکتا ہے جس میں آپ حواس ظاہری سے بے تعلق ہو کر عالم یقین و مشاہدہ کی حقیقتوں کو علیٰ وجہ البصیرت دریافت کر سکیں اور پھر انہیں محفوظ بھی رکھ سکیں۔ لیکن یہ حضرات بھی اگر اپنے احوال گرد و پیش کا جائزہ لیں، اور زندگی کے بعض نادر اور اہم واقعات کا عمقِ نظر سے مشاہدہ کریں تو انہیں اس دنیا میں ہی بعض ایسی مثالیں نظر آجائینگی جن سے عالم مجردات کی نسبت اُن کا استبعاد دور ہو سکتا ہے، اور وہ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے حواس خمسہ کے علاوہ بھی بعض ایسی قوتیں ہیں جن کے ذریعہ ہم بالکل حواس کی طرح اشیاء کو محسوس و معلوم کر سکتے ہیں۔

غالباً دو برس کی بات ہے، پنجاب کا ایک شخص خدا بخش نامی دہلی میں آیا تھا۔ اُس نے اپنے کمالات کا مظاہرہ نئی دہلی کے ایک مشہور سکھ کی کوٹھی پر کیا۔ اس موقع پر دہلی کے چند عمائد کے ساتھ اخبار اسٹیٹسمین کا نمائندہ بھی موجود تھا، اور خود اُس نے اپنی چشم دید رپورٹ اخبار میں شائع کرائی تھی، اُس رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ "خدا بخش کی آنکھوں پر ایک بہت موٹی پٹی باندھ دی گئی اور پھر اُسے ایک ایسے کمرہ سے گذرنے

کے لیے کہا گیا جس میں جا بجا منتشر کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ خدا بخش اسی حالت میں ایک بینا انسان کی طرح کرسیوں سے بچتا بچاتا۔ کمرہ سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد خدا بخش کو مختلف انگریزی اور اُردو کے اخبارات پڑھنے کے لیے دیے گیے۔ اُس نے انہیں بھی بالکل صاف صاف بغیر کسی دقت اور دشواری کے پڑھ دیا۔ اپنے اس کمال کا مظاہرہ کرنے کے بعد خدا بخش نے ایک تقریر کی جس میں اُس نے بتایا کہ دراصل انسان کے دماغ میں آگے کی جانب بعض ایسے غدود ہوتے ہیں کہ اگر مشق بہم پہنچائی جائے تو اُن سے آنکھوں کا کام لیا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر آنکھیں بالکل ضائع ہو جائیں اور اُن سے قوتِ بصارت سلب کرلیجائے تو انسان ان غدود کے ذریعہ چیزوں کو دیکھ سکتا اور کتاب وغیرہ بھی بے تکلفی سے پڑھ سکتا ہے۔

تقریر کے آخر میں خدا بخش نے کہا کہ میں نے سالہائے دراز کی مشق و ممارست کے بعد یہ کمال حاصل کیا ہے۔ لیکن میں اب بھی اس پر قانع نہیں ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو ابھی اور اس قوت میں اضافہ کرنا چاہیے"

اس واقعہ کے علاوہ ایک نہایت عجیب وغریب عمل جس کا میں نے اپنے متعدد احباب واکابر کے ساتھ بارہا مشاہدہ کیا یہ ہے کہ ہمارے ندوۃ المصنفین کے رفیق اعلیٰ مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی سانپ کے کاٹے کا ایک ایسا عمل جانتے ہیں جس کے ذریعہ کسی شخص کو خواہ کیسے ہی زہریلے سانپ نے کاٹا ہو اور مارگزیدہ مولانا موصوف سے خواہ کتنے ہی فاصلہ پر ہو۔ جو شخص مولانا کو سانپ کے کاٹنے کی اطلاع دیگا، مولانا اُس کو دو تین منٹ کچھ پڑھ کر پانی پر دم کرینگے اور جو شخص خبر لایا ہے اُسے وہ پانی پلائینگے۔ اِدھر یہ شخص پانی پئیگا اور اُدھر مارگزیدہ اچھا ہونا شروع ہو جائیگا۔ اب وہ لوگ جو کلام کی حقیقت بغیر اعضا، واعصاب سمجھ ہی نہیں سکتے اس پر غور کریں اور بتائیں کہ آخر مخبر کے پانی پینے اور مارگزیدہ کے اچھے ہو جانے میں تعلق کیا ہے؟ پھر مخبر پیتا بھی پانی ہے، کوئی تریاق تو نہیں پیتا، یہ چند بول جو پڑھ کر پانی پر دم کیے گئے ہیں، الفاظ وکلمات ہی تو ہیں، ان میں یہ اثر کہاں سے آگیا کہ ان کا دم کیا ہوا پانی ایک دوسرا شخص کوسوں اور میلوں دور کی مسافت

پر پیتا ہے، اور اُس کے حلق سے پانی کا پہلا گھونٹ اُترتا ہے کہ مارگزیدہ پر زہر کا اثر کم ہونے لگتا ہے، یہاں تک کہ بالکل زائل ہو جاتا ہے۔ اگر مادیت کے رسوم و قیود میں بند انسان اپنے محدود سلسلۂ علت و معلول کی روشنی میں اس کی کوئی توجیہ و تعلیل نہیں کر سکتا لیکن مشاہدہ کر سکتا ہے، تو پھر اس میں استبعاد کی کیا بات ہے کہ صوتِ ایزدی تمثیلاً صلصلۃ الجرس کی شکل میں گوشِ محمدی کے لیے سامعہ نواز ہوئی اور وہ سب کچھ کہہ گئی یا بتا گئی اور یاد کرا گئی جو وہ قلبِ پُر انوارِ نبوت میں ودیعت رکھنا چاہتی تھی۔ اور جس نے ایک بندۂ اُمّی کو علم و حکمت کے خزانوں کا مالک بنا دیا۔ یہ سب کچھ کیونکر ہوا؟ کس طرح ہوا؟ اور کیا ہو بھی سکتا ہے؟ تم اگر ہم سے ان کا جواب پوچھتے ہو، تو ہم تم سے کہینگے کہ عملِ مارگزیدگی کی فلسفیانہ تعلیل پہلے تم کر دو پھر ہم تمہیں بھی بتا دینگے کہ یہ سب کچھ کس طرح ہو گیا تھا۔

تم سے اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے دہلی میں ایک شخص تھا جو آنکھوں پر تہ بہ تہ پٹی کے بندھے ہونے کے باوجود بینا انسانوں کی طرح چلتا پھرتا تھا اور کتاب و اخبار بے تکلفی سے پڑھ لیتا تھا، تو بتاؤ کیا تم ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا یقین کرتے؟ ہرگز نہیں بلکہ تم اور اُلٹا اس واقعہ کے نقل کرنے والے کو وہم پرست اور سادہ لوح، اور بے عقل اور خدا جانے کیا کیا کہتے، لیکن آج تمہاری مجال نہیں ہے کہ تم اس واقعہ کی تردید کرو، اور کہنے والے کو جھٹلاؤ۔ کیونکہ دہلی میں اسے متعدد لوگوں نے دیکھا، مشہور انگریزی اخبار اسٹیٹسمین کے نمائندہ نے بچشم خود دیکھا، اور واقعہ کی سب رپورٹ اپنے اخبار میں درج کرائی۔

"صلصلۃ الجرس" کی مخصوص نوعِ وحی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مقام پیش آتا تھا، اُس کی تشریح اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہی کر سکتا ہے جو اپنی باطنی اور روحانی قوتوں کی وجہ سے عقل اور نفس کے ملکات اور عالمِ تجرد کے ساتھ ان دونوں کے تعلقات سے آگاہ ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ سے بڑھ کر ان اسرار و رموز کا کون محرم ہوگا! آپ حجۃ اللہ البالغہ کی جلد دوم بحث فی المقامات والاحوال میں فرماتے ہیں:۔

انّ القلبَ لہٗ وجہان، وجہٌ یمیل الی   قلب کے دو رخ ہیں، ایک رُخ بدن اور اعضاء کی طرف

البدن والجوارح ووجہٌ یمیل الی التجرد
والصرافۃ وکذلک العقل لہ وجہان
وجہٌ یمیل البدن والحواس ووجہٌ
یمیل الی التجرد والصرافۃ، فسموا ما
یلی الجانب السفل قلباً وعقلاً وما
یلی الجانب الفوق روحاً وسرّاً ،
فصفۃ القلب الشوق المزعج والوجد
وصفۃ الروح الانس والانجذاب و
صفۃ العقل الیقین بما یقرب ماخذہ
من ماخذ العلوم العادیۃ کالایمان
بالغیب والتوحید الافعالی وصفۃ
السرّ شہود ما یجلّ عن العلوم
العادیۃ وانما ھو حکایۃ ماعن
المجرد الصرف الذی لیس فی
زمان ولامکان ولا یوصف بوصف
ولا یشار الیہ باشارۃ .

مائل رہتا ہے اور دوسرا رُخ تجرد اور صرافت کی طرف
متوجہ رہتا ہے۔ اسی طرح عقل کے بھی دو رُخ ہیں۔
ایک رُخ بدن اور حواس کی جانب مائل رہتا ہے
دوسرا رُخ تجرد اور صرافت کی جانب۔ پس جو رُخ
جانب سفل سے متصل ہے اُسے قلب اور عقل کہتے
ہیں اور جو جانب فوق سے متصل ہے اُسے روح اور سر
کہتے ہیں۔ اور قلب کی صفت شوقِ بے پایاں اور وجد
ہے، اور روح کی صفت مانوس ہونا اور منجذب ہونا ہے
عقل کی صفت ان چیزوں پر یقین کرنا ہے جن کا ماخذ
علوم عادیہ (رسمیہ) سے قریب ہو۔ جیسے ایمان بالغیب اور
توحیدِ افعالی۔ اور "سر" کی صفت اُن حقائق کا مشاہدہ
کرنا ہے جو علوم عادیہ سے وراء الورا ہیں۔ اور یہ بجز اس
کے نہیں کہ یہ حکایت ہے اُس مجرد صرف سے جو نہ زمان
میں ہے اور نہ مکان میں ہے۔ وہ نہ کسی وصف سے
موصوف کیا جا سکتا ہے اور نہ اُس کی جانب کوئی
اشارہ ہو سکتا ہے۔

غور کیجیے حضرت شاہ صاحب نے کس خوبی اور وضاحت سے بتایا ہے کہ روح کی صفت انس اور انجذاب ہے۔ اور سر کی صفت شہود و معائنہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھیے کہ روح کی صفت انفعالی ہے اور سر کی فعلی ان دونوں کیفیتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی سعادتمند روح پر جب آفتابِ حقیقت پرتو فگن ہوتا ہے تو اس کی شعاعیں

شبنم کے قطروں کی طرح اس روح کو اپنے جلوہ گاہ انوار میں جذب کرلیتی ہیں۔ پھر عقل کا دوسرا رُخ جو جانب فوق سے متصل ہے یعنی سِر، وہ اُبھرتا ہے اور اب وہ اُس مجرد صرف سے حکایت کرنے لگتا ہے جو ولا عین رأت ولا اذن سمعت کا مصداق ہے اور جو زمان ومکان کی حدبندیوں سے بلند وبالا ہے۔

اس موقع پر یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ قلب اور عقل یہ دونوں جس طرح انبیاء میں ہوتی ہیں اور انسانوں میں بھی ہوتی ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ انبیاء کرام میں قلب اور عقل کا وہ رُخ جو روح اور سر کہلاتا ہے اس درجہ قوی ہوتا ہے کہ کسی اور انسان کا ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا حال بالکل قوتِ غضبی، قوت شہوی، اور قوتِ نظری کا سا ہے۔ کہ یہ تینوں کم یا زیادہ تمام انسانوں میں پائی جاتی ہیں، لیکن انبیا، ورسل کی ان تین قوتوں میں ایسا اعتدال ہوتا ہے کہ کسی اور انسان میں اس طرح کا اعتدال نہیں پایا جاتا۔ اس بنا پر ان کو عالم فوق سے اتصال ہوتا ہے اور اُنہیں ایسے ایسے مقامات اور احوال ومزایا پیش آتے ہیں جو دوسروں کے وہم وخیال میں بھی نہیں آسکتے۔ قرآنِ مجید میں حضور پرنور کی زبان سے جو ارشاد فرمایا گیا ہے "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ" تو اس میں اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ اعضاء وجوارح میں انسانوں کے ساتھ مشارکت کی بنا پر ہے۔ اور پھر یوحیٰ الیّ جو فرمایا گیا تو اس میں اُس حقیقت کی طرف ہی اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و عقل کے دو فوقانی رُخ جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زبان میں "روح" اور "سر" ہیں وہ اس درجہ بلند اور ارفع ہیں کہ آنحضرت مہبط وحی ہیں۔ لیکن انسان انسان ہونے کے باوجود جس طرح ایک بزدل انتہائی بہادر کے شجاعانہ کارناموں کو، ایک غبی پرلے درجہ کی ذکاوت وذہانت رکھنے والے انسان کی دماغی بلند پروازیوں اور ذہنی کمالات کو نہیں سمجھ سکتا۔ اور جب ان کا ذکر سُنتا ہے تو حیرت واستعجاب سے انگشت بدنداں ہوکر رہ جاتا ہے اسی طرح مجرد صرف"، "ذاتِ حق" اور "حقیقتِ مطلقہ" سے قرب واتصال کے باعث انبیاء کرام پر جن اسرار الٰہیہ کا فیضان ہوتا ہے، ہم لوگ جب ان کا ذکر سنتے ہیں تو ہمیں حیرت ضرور ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ امور ہمارے لیے ناقابلِ فہم ہوتے ہیں۔ لیکن کسی شے کا ہمارے لیے حیرت انگیز یا ناقابل فہم ہونا اس بات کی ہرگز دلیل نہیں

ہوسکتا کہ اُس شے کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ جو لوگ اس طرح کی جسارت کرتے ہیں وہ خود اپنی عقل اور نفس کو فریب دیتے ہیں اور اُن سے یہ کہا جا سکتا ہے :۔

تو کارِ زمیں را نکو ساختی؟ کہ با آسماں نیز پرداختی!

مولانا شبلی مرحوم نے صحیح بخاری کی حدیث وحی پر کلام کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے "آپ نے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے) کیا دیکھا؟ ناموس اعظم (حضرت جبریل) نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں" ایک مادر زاد اندھے کو روشنی کی حقیقت لاکھ کھول کر سمجھائیے لیکن کوئی بات اُس کے ذہن نشین نہیں ہوتی تو کیا محض اس بنا پر نابینا کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ روشنی کے وجود کا ہی سرے سے انکار کر دے؟

سطورِ بالا میں صلصلۃ الجرس کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کے ارشاد کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے نفس آواز سے بحث نہیں کی یعنی یہ نہیں بتایا کہ یہ آواز خدا کی تھی، یا فرشتۂ وحی کی۔ یا خود وحی کی آواز تھی۔ انہوں نے صرف اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ آواز خواہ کسی کی ہو، اس کو زبانِ نبوت نے صلصلۃ الجرس کے ساتھ کیوں تشبیہ دی ہے، اور پھر حضرت شاہ صاحب نے جو اس کی وجہ بیان کی ہے، اُس کی تشریح اُنہوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں مختلف مقامات پر اصلاً یا ضمناً کر دی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مختصراً اس کا ذکر بھی کر دیا جائے کہ یہ آواز کس کی تھی! اس باب میں سب سے زیادہ نمایاں مسلک امام بخاری کا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ آواز خدا کی ہوتی تھی جو تمام فضا میں گونج جاتی تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ وسلم کے سوا کوئی اور اس کو نہیں سن سکتا تھا۔ چنانچہ امام بخاری نے کتاب التوحید میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی یہ روایت نقل کی ہے۔

اذا تکلم اللہُ بالوحی سمِعَ اھلُ	اللہ تعالیٰ جب کلام بالوحی کرتا ہے تو اہل سماوات کچھ
السمٰوات شیئًا فاذا فُزِّعَ عن	سُنتے ہیں۔ پھر جب اُن کے قلوب سے خوف وہراس کم

قلوبهم وسكن الصوت عرفوا انّه ٗ — ہوجاتا ہے اور آواز ٹھہر جاتی ہے تو وہ پہچانتے ہیں کہ یہی
الحقّ ونادوا ماذا قال ربّكم — حق تھا۔ اور وہ آپس میں ندا کرتے ہیں کہ تمہارے رب نے
قالوا الحق — کیا کہا، وہ کہتے ہیں کہ حق"

اسی سلسلہ میں امام بخاری نے ایک اور روایت نقل کی ہے جو عبداللہ بن انیس سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے، ایک مرتبہ آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کو جمع کریگا، اور اُن کو ایسی ندا دیگا کہ قریب و بعید سب اُسے یکساں سُنینگے" لیکن یہ آواز کیسی ہوگی؟ اس کے متعلق صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات کو مخلوق کی کسی صفت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی آواز کو بھی کسی مخلوق کی آواز پر قیاس نہیں کر سکتے پھر آگے چل کر ایک باب کا ترجمہ وَكَلَّمَ اللهُ موسىٰ تكليمًا مقرر کیا اور اس کے ذیل میں چند احادیث بیان کیں۔ اس سے بھی اشارہ اسی امر کی طرف ہے کہ چونکہ فعل کلّم کی تاکید مصدر تکلیم کے ساتھ لائی گئی ہے اس لیے علماء نحو کے اجماع کے مطابق یہاں کلام سے مُراد حقیقت ہے مجاز نہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے وادی سینا میں جو آواز سُنی تھی وہ سچ مچ خدا ہی کی آواز تھی"۔ امام بخاری نے جہمیہ کی تردید میں کتاب التوحید میں اور بھی بعض احادیث پیش کی ہیں اور اُن سے یہ ثابت کیا ہے کہ خدا کے لیے صوت پائی جاتی ہے۔ ارباب تصوف و عرفان میں شیخ اکبر کا جو مرتبہ ہے کسی اہل علم سے مخفی نہیں۔ وہ بھی خدا کے لیے صوت مانتے ہیں اور حدیث صلصلۃ الجرس پر کلام کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ اللہ کی آواز کے لیے کوئی جہت اور سمت متعین نہیں کی جا سکتی، اور چونکہ گھنٹہ کی آواز کا حال بھی یہی ہے، وہ ہر طرف سُنی جا سکتی ہے۔ اس لیے صوتِ وحی کو گھنٹہ کی آواز سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن اکثر علماء جن میں صحیح بخاری کے شارحین بھی ہیں اس آواز کو فرشتوں کے پروں کی، یا فرشتہ کی زبانی وحی کی آواز سمجھتے ہیں۔ حافظ ابن حجر ان میں سے پہلی صورت کے قائل ہیں۔ واللہ اعلم۔

اب تک حافظ ابن قیمؒ کے بیان کے مطابق وحی کی تیسری صورت کا ذکر تھا، چوتھی صورت یہ تھی کہ فرشتہ اپنی اصلی شکل میں آتا تھا اور اللہ کا پیغام آپ تک پہنچاتا تھا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل کو ان کی اصلی شکل میں دو مرتبہ دیکھا ہے، ایک مرتبہ واقعہ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اور ایک دفعہ کسی اور مقام پر غالباً اجیاد میں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں سورۂ نجم کی مندرجہ ذیل آیات انہیں دونوں واقعوں سے متعلق ہیں۔ معراج کے علاوہ آنحضرت نے جو جبرئیل امین کو اُن کی اصلی شکل میں دیکھا تھا اُس کا ذکر ان آیات میں ہے۔

عَلَّمَہٗ شدید القویٰ . ذو مرّۃٍ	اُن کو بڑی طاقتوں والے اور مضبوط نے تعلیم دی، پھر وہ
فاستویٰ وھو بالافق الاعلیٰ.	سیدھا ہوگیا اور وہ بہت اوپر آسمان کے کنارہ پر تھا،
ثم دنا فتدلّٰی. فکان قاب	پھر وہ قریب ہوا، اور لٹک گیا۔ اب فاصلہ دو کمانوں
قوسین او ادنیٰ فاوحیٰ الیٰ	کی برابر یا اس سے بھی کم تھا۔ اور اب خدا نے اپنے بندے
عبدہٖ ما اوحیٰ۔ ما کذب الفؤاد	پر وحی کی جو کی۔ دل نے جھوٹ نہیں کہا جو دیکھا۔ کیا تم
ما رایٰ . افتمارونہٗ علیٰ ما یریٰ	لوگ پیغمبر سے اُن چیزوں پر جھگڑتے ہو جو اُنھوں نے دیکھی ہیں۔

ان آیات میں جبرئیل امین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں۔ سورۂ تکویر میں بھی ان میں سے بعض کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اِنّہٗ لقولُ رسولٍ کریمٍ ذی قوّۃٍ	یہ کہا ہوا ہے کہ ایک کریم قاصد کا جو طاقتور ہے اور عرش
عِندَ ذِی العرشِ مکینٍ مُطاعٍ	کے مالک خدا کے نزدیک وقیع ہے۔ اس کی اطاعت
ثَمَّ امین وما صاحبکم بمجنونٍ	کی جاتی ہے اور وہاں امانت دار ہے، اور تمہارے ساتھی
ولقد راٰہُ بالافقِ المبین .	آنحضرت مجنوں نہیں ہیں، اُنھوں نے فرشتہ کو افق مبین میں دیکھا ہے

۱؎ صحیح بخاری کتاب التفسیر۔

سورۂ النجم اور سورۂ تکویر کی ان آیتوں پر غور کیجیے۔ ان میں یہ بات مشترک ہے کہ جبریل امین کی صفت ذی قوۃٍ اور امین بیان کی گئی ہے۔ اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان کو اُفق اعلیٰ پر دیکھا ہے اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ اس مرتبہ فرشتۂ وحی کا نزول کسی غیر معمولی اور عظیم و جلیل شکل میں ہوا تھا، اور دوسری یہ کہ فرشتہ نے خود اپنی زبان سے وحی کا تلفظ کیا، اور حضور تک اُس کو پہنچایا۔ انہ لقول رسول کریم سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔ پھر دونوں صورتوں میں فرشتہ کے ورود و نزول کے بیان کے بعد اس کی بھی تصریح کردی گئی ہے کہ آنحضرت نے جو کچھ دیکھا اور سُنا وہ حق تھا۔ آپ کا دل ایک ایک بات کی تصدیق کر رہا تھا، اُسے کوئی اشتباہ نہیں تھا۔

دوسرا واقعہ جبریل کو اصل شکل میں دیکھنے کا جو معراج میں پیش آیا۔ اُس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

ولقد راٰہ نزلۃً اُخریٰ . عِندَ	اور آنحضرت نے فرشتہ کو دوسری مرتبہ بھی اُترتے ہوئے
سِدرۃِ المنتہیٰ . عِندَھا جَنّۃُ	دیکھا، سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس کے قریب جنّۃ
الماویٰ . اِذ یغشی السِدرۃَ	الماویٰ ہے۔ اُس وقت سدرہ پر عجیب و غریب انوارِ
مَا یغشیٰ . ومازاغَ البصرُ وما	الٰہی چھائے ہوئے تھے (مگر) نہ نگاہ بہکی اور نہ سرکشی
طغیٰ .	کی۔

جیسا کہ ہم نے لکھا ہے، علماء کے ایک گروہ کا خیال یہی ہے کہ سورۂ النجم کی آیات بالا دونوں واقعوں سے متعلق ہیں اور وہ آیات کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے دونوں پر چسپاں کردیتے ہیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے لیکن اس تقریر پر متعدد شبہات وارد ہوگئے ہیں جن میں غالباً سب سے قوی اعتراض یہ ہے کہ اگر" ولقد راٰہ نزلۃً اُخریٰ میں ضمیر منصوب کو حضرت جبریل کی طرف راجع کیا جائے۔ جیسا کہ اکثر مفسرین نے کیا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری مرتبہ جبریل کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اُترتے ہوئے دیکھا۔ اس پر اشکال یہ ہے کہ جبریل سدرۃ المنتہیٰ سے

اوپر تو جا ہی نہیں سکتے۔ پھر اُن کا یہ نزول کیا معنی رکھتا ہے؟ دوسرا اشکال یہ ہے کہ فاوحیٰ الی عبدہٖ مااوحیٰ میں اگر اوحیٰ کی ضمیر مرفوع مستتر کو جبریل کی طرف لوٹایا جائے۔ تو اس کے معنیٰ یہ ہونگے کہ وحی کرنیوالے جبریل امین ہیں، حالانکہ اسی سورۃ کے شروع میں عَلَّمَہٗ شدیدُ القویٰ فرماکر اُن کی حیثیت مُوحِیْ کی نہیں۔ مُعَلِّم کی بتائی گئی ہے۔ اور قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی "ایحار" کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے مثلاً ایک مقام پر ہے۔ "وَاِن اھتدیتُ فبما یوحِیْ الیَّ رَبِّی" ایک جگہ ہے ذٰلک مِمَّا اوحی الیک ربُّک من الحکمۃ ایک سورۃ میں ہے "وَالَّذِی اوحینا الیک مِنَ الکتٰبِ ھوالحقُّ مُصَدِّق قالما بین یدیہ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ ذٰلک مِنْ اَنباءِ الغیب نوحیہ الیک۔ اگر کہیں یوحی بصیغہ مجہول لایا گیا ہے تو وہاں بھی مِن ربّی فرماکر اس کی وضاحت کردی گئی ہے کہ ایحار اللہ تعالیٰ کا ہی فعل ہے جیسے اس آیت میں:۔ "قل اِنما اتبع ما یوحیٰ الیَّ من ربی ھٰذا بصائرِمن ربکم وھُدًی ورحمۃٌ لقومٍ یؤمنون"۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ بعض آیات میں ایحار کی نسبت خود جبریل امین کی طرف بھی کی گئی ہے لیکن ایسے مواقع پر اُن کی حیثیتِ رسول بھی متعین کردی گئی ہے، اور ساتھ ہی خدا کا بھی ذکر ہے، جیسے اس آیت میں "او یُرسِلَ رسولًا فیوحی باذنہ مَایشاءُ" اس سے مقصد یہ ہے کہ جہاں التباس واشتباہ کا خدشہ نہ ہو جبریل امین کی طرف ایحا، کی نسبت کردینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

ان اشکالات کے باعث سورۂ النجم کی یہ آیات بھی مشکلاتِ قرآن میں شمار کی گئی ہیں جن پر افسوس ہے کہ بعض مفسرین اور علماءِ سیرت نے کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ اور جو کلام کیا ہے وہ محض سطحی اور سرسری ہے۔ اس موقع پر ہم ذیل میں مختصراً وہ تقریر نقل کرتے ہیں جو حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مشکلات القرآن میں کی ہے، اور جسے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے بھی فتح الملہم کی جلد اول میں صفحہ ۳۳۵-۳۳۶ پر نقل کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"اس سورۃ میں نجم (ستارہ) کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ اس کے مابعد جو کلام ہے وہ آسمان کی خبر

اور معراج وغیرہ سے متعلق ہے۔ ان آیتوں کا خلاصہ اور لبِ لباب یہی چیزیں ہیں ان ھُوَ الّا وحیٌ یوحیٰ میں یوحیٰ بصیغۂ مجہول لایا گیا اور مُوحی کی کوئی تعیین نہیں کی گئی۔ کیونکہ ایحا بجز اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے لیے ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وصف خدا میں منحصر ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جو اوصاف موصوف کی ذات میں منحصر ہوں اُن کا ذکر خود موصوف کے تسمیہ سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہیں "مررت باکرم القوم" اس کے بعد فرمایا گیا "علّمہٗ شدید القویٰ" اس میں مُوحی کے ذکر کے بعد معلم کی طرف انتقال ہے، کیونکہ یہاں دو ذات گرامی ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ جو موحی ہے اور دوسرا معلم جو جبریل ہیں۔ اس کے بعد معلم کے اوصاف بتائے گئے۔ کیونکہ اس وقت کلام اہل مکہ کے ساتھ ہے، اور وہ جبریل کی معرفت نہیں رکھتے تھے، اس لیے جبریل کی صفت اور اُن کا فعل بیان کیا گیا اور یہی وہ اوصاف ہیں جو سورۂ تکویر میں بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ان آیات کا مقصد گویا یہ بتانا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کس طرح آتی تھی، اور اُس کی صفت کیا تھی۔ حضرت الاستاذ نے اس کے بعد حافظ ابن قیم کی تفسیر کی روشنی میں ذومرۃٍ فاستویٰ کے مطلب کی تشریح کی ہے جس کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ پھر فتدلّٰی کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جیسا کہ قاضی بیضاوی نے ذکر کیا ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس حالت میں جبریل اپنے مکان سے متجاوز نہیں ہوتے تھے کیونکہ تدلّی کے معنیٰ ہیں استرسال مع التعلق جیسے پھل کے لٹک آنے کو تدلّی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جبریل امین کی تدلّی کی مثال اُس روشنی کی مانند ہے جو فضا میں پھیلی ہوئی ہو۔ اور کسی روشندان میں سے ہو کر بھی گذر رہی ہو اس کو دیکھنے والا اپنے گھر میں دیکھتا ہے، مگر پھر بھی وہ جانتا ہے کہ روشنی اپنے موضع سے منفصل نہیں ہے۔ تدلّی کے لفظ سے جب یہ معنیٰ مراد لیے جائیں تو اس سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ حضرت جبریل کس طرح بصورتِ بشر آتے تھے۔ اس کے بعد فرمایا گیا "فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ" اس میں ضمیر اللہ کی طرف لوٹتی ہے جبریل کی طرف نہیں۔ امام طبری کے نزدیک اس کے معنیٰ یہ ہیں فاوحی اللہُ اِلیٰ ما اوحی یہی معنیٰ امام مسلم کے نزدیک مُراد ہیں۔ اور امام بخاری نے شریک بن ابی نمر سے جو روایت نقل کی ہے اُس سے بھی یہی معنیٰ مستفاد

ہوتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل (مسند ص ۱۴۹ ج ۳) نے ثابت عن انسؓ کے طریق سے جو روایت کی ہے اُس سے بھی اسی معنیٰ کی تائید ہوتی ہے۔ ان سب روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آیت "فاوحیٰ الی عبدہٖ ما اوحیٰ" واقعہ معراج (لیلۃ الاسراء) سے متعلق ہے۔ چنانچہ "مواہب" میں ابن خزیمہ نے اسناد قوی سے حضرت انس سے روایت کی ہے رای محمدٌ ربّہٗ اہ (روح المعانی ص ۱۱ ج ۲۷) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کو بالکل عام رکھا جائے۔ اس سلسلہ میں ان روایات کی مراجعت کرنی چاہیے جو ابن کثیر ص ۳۲۵ ج ۵ میں بطریق بن ابی الکتلہ اور مسند احمد ص ۲۴۰ ج ۳ میں امام احمد سے منقول ہیں

پوچھا جاسکتا ہے کہ اس صورت میں جبکہ اوحیٰ الی عبدہٖ ما اوحیٰ میں اوحیٰ کا فاعل جبریل کے بجائے خدا کو بنایا جائے۔ انتشار ضمائر اور انفکاک فی النظم لازم آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شبہ محض بے بنیاد اور نادرست ہے۔ کیونکہ ایحار کا وصف اللہ تعالیٰ میں منحصر ہے۔ اور سورہ النجم کی ان آیات میں دو کا ذکر کیا گیا ہے، ایک موحی اور دوسرا معلم، اس بنا پر اوحیٰ کی ضمیر مستتر خدا کی طرف ہی راجع ہونی چاہیے۔ انتشار ضمائر معنیٰ میں التباس و اشتباہ کا باعث ہوتا ہے، اس بنا پر وہ ناجائز ہے لیکن یہاں معنیٰ میں اشتباہ کا امکان ہی نہیں۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ ان آیات میں عطف واو کے ذریعے سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ ایک مرتب سلسلہ ہے جس میں بعض چیزیں بعض چیزوں پر خارج میں مرتب ہوتی چلی گئی ہیں اور ان سب کی انتہا اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے "فاوحیٰ الی عبدہٖ ما اوحیٰ" اُس مضمون کے لیے بطور خلاصہ ہے جو "ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ" میں بیان کیا گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہ استیناف ہے، یعنی جو مضمون پہلے بیان کیا گیا ہے، اب پھر اُسی کو بیان کیا جا رہا ہے، جیسا کہ اِھدِنَا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیھم میں کیا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ما کذب الفؤاد ما رایٰ اس کو ماقبل سے منفصل لایا گیا، اور عطف نہیں

کیا گیا۔ کیونکہ یہ دل سے اللہ کی رویت، اور جبریل امین کی ان کی اصلی شکل میں رویت کے مضمون پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں رویتیں معراج سے پہلے کی ہیں۔ پھر ما رائی میں اللہ اور جبریل کی رویت کے علاوہ وہ تمام چیزیں بھی ہیں جو آپ نے شب معراج میں دیکھیں۔ چنانچہ آگے چل کر فرمایا گیا ہے:۔

لقد رائی من آیات ربہ الکبریٰ　　آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ذکر ہے۔

لِنُرِیَہٗ من آیاتنا　　تاکہ ہم آپ کو اپنی آیات دکھائیں

پھر اسی مقام پر ہے:۔

وما جعلنا الرؤیا التی اریناک　　اور جو رویا ہم نے آپ کو دکھایا ہے ہم نے اس کو لوگوں

الا فتنۃً للناس۔　　کے لیے آزمائش کی چیز بھی بنایا ہے۔

اس آیت میں جو فتنہ ہے یہ وہی مماراۃ (جھگڑنا) ہے، جس پر افتمارونہ علیٰ ما یریٰ فرما کر ممارات کرنیوالوں کو زجر و توبیخ کی گئی ہے۔ اس تقریر سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ ما کذب الفواد ما رائی کی تقدیر عبارت یوں ہے:۔ ما کذب الفواد عبدنا ما رائی اس رائی کا فاعل "عبد" یعنی آنحضرت ہیں اور یہ رویت عام ہے خواہ دل کے ذریعہ سے ہو یا آنکھ سے اس صورت میں کذب متعدی بدومفعول ہوگا، اور اس میں کوئی خرخشہ نہیں کیونکہ تکذیب کی طرح کذب بھی متعدی بدومفعول ہو کر آتا ہے۔ مثلاً ہم کہیں صدقت فلاناً الحدیث وکذبتہٗ اور اس کا بھی احتمال ہے کہ اس کو مفعول واحد پر ہی مقتصر مانا جائے۔ جیسا کہ امام نووی نے فراء سے نقل کیا ہے۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہونگے کہ دل نے اس معاملہ میں جھوٹ نہیں بولا، یعنی اس نے وہی کہا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ الاسراء میں عیاناً دیکھا۔ آگے چلیے ارشاد ہوتا ہے۔ ولقد راٰہ نزلۃً اُخریٰ۔ اس میں اگر رائی کا فاعل آنحضرت کو نہ بنایا جائے۔ بلکہ فواد کو بنایا جائے تو یہ زیادہ واضح بات ہوگی۔ اور اب اس صورت میں معنیٰ یہ ہونگے کہ قلب نے جو کچھ دیکھا تھا اس کو من وعن

بیان کردیا۔ اور اس میں جھوٹ نہیں کہا۔ یہاں رویت سے مراد رویت فواد ہوگی۔ اور آگے جو لقد رأی من آیات ربہ الکبریٰ ہے۔ وہاں اس سے مراد رویت بصر ہے۔ چونکہ رویت امر واحد ہے۔ خواہ دل سے یا آنکھ سے، فرق صرف فاعل کا ہے، اس لیے عبارت میں انفکاک اور نظم میں انتشار پیدا نہیں ہوتا۔

مرفوع احادیث اور صحیح آثار سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی رویت دو مرتبہ ہوئی ہے۔ ایک دفعہ دل سے، اور دوسری مرتبہ آنکھ سے۔ ما کذب الفواد ما رأی کے بعد جو افتمارونہ علی ما یریٰ ہے اس میں بجائے رأی بصیغہ ماضی کے یریٰ بصیغہ مضارع فرمانا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ رویت اولیٰ کے علاوہ کوئی اور رویت ہے۔ حضرت ابن عباس کا ایک اثر ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ اپنی نگاہ سے اور دوسری مرتبہ دل کے ذریعہ چنانچہ ولقد رآہ نزلۃً اخریٰ میں جو رویت ہے وہ دونوں خدا اور جبریل سے متعلق ہے۔ حضرت جبریل کی رویت تو ظاہر ہے ہی، اللہ کی رویت ماننے کی صورت میں یہ کہنا پڑیگا کہ جس طرح بعض احادیث میں آتا ہے کہ خدا رات کے ثلث آخر میں سماءِ دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے، اسی طرح اس آیت میں بھی نزلۃً اخریٰ کے معنی نزول الٰہی کے ہونگے۔ اب رہا "عند سدرۃ المنتہیٰ" تو یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس کا تعلق یریٰ کے ساتھ نہیں بلکہ رأی کے ساتھ ہے جیسے ہم کہتے ہیں۔ "رأیت الھلال عند المسجد" اس سے وہ اعتراض جاتا رہا جس کا شروع میں ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ سدرۃ المنتہیٰ حضرت جبریل کا انتہائی مقام پرواز ہے تو پھر اُن کے لیے سدرہ پر نزول کیسے ہوسکتا ہے۔

حضرت الاستاذ کی تقریر نہایت مبسوط و مفصل ہے۔ اور اُس میں آپ نے عجیب و غریب نکات و لطائف مستند حوالوں کی روشنی میں بیان کیے ہیں۔ میں نے مذکورہ بالا انتخاب میں جستہ جستہ وہی حصے لیے ہیں جو یہاں موضوع بحث سے متعلق ہیں[1]۔ اس تقریر سے یہ امر بالکل ظاہر ہو جاتا ہے کہ سورۃ النجم کی آیات مبحوث

[1] پوری تقریر کے لیے دیکھئے مشکلات القرآن مطبوعہ مجلس علمی ڈابھیل از صفحہ ۲۴۰ تا صفحہ ۲۶۲

عنہا صرف واقعۂ معراج کے بارہ میں ہیں اوران میں لیلۃ الاسراء کے ہی احوال وکیفیات کونہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ وحی اس واقعہ کی ابتدائی منزل ہے اس لیے شروع میں وحی کی صفت، اوراُس کی کیفیت وامکان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اِن آیات کے مطابق حضرت جبریلؑ کی اُن کی اصلی شکل میں ایک رویت تو یہ ہے۔ اب رہی دوسری رویت جس کا ذکر حضرت عائشہؓ نے کیا ہے۔ تو اس کی نسبت روایتیں مختلف ہیں۔ حضرتِ عائشہؓ کی ہی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ رویت ایک مقام جس کا نام "اجیاد" ہے وہاں ہوئی تھی بعض روایتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غار حرا میں آپ پر جب پہلی وحی "اقرأ باسم ربك" نازل ہوئی ہے تو اُس دفعہ جبریلؑ اپنی اصلی شکل میں ہی تشریف لائے تھے بعض روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرکار دوجہاںؐ نے ایک مرتبہ خود حضرت جبریلؑ سے فرمائش کی تھی کہ وہ اپنی شکل میں آئیں۔

(۵) پانچویں قسم وحی کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی فرشتہ یا آواز کے توسط کے براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر وحی نازل فرمائے جیسے لیلۃ المعراج میں پانچ نمازوں کو فرض کیا گیا

(۶) اللہ کا آنحضرتؐ سے کلام کرنا بغیر کسی واسطہ کے۔ کلام کا یہ مرتبہ نص قرآن حضرت موسیٰؑ کے لیے تو ثابت ہے ہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی بعض احادیث سے واقعہ معراج میں ثابت ہوتا ہے

(باقی)